'الجہاد فی الاسلام' کے پس منظر میں!

مراد علوی ○

گذشتہ دو صدیوں سے رومیوں نے مسلمانوں کو پہلے تو سیاسی طور پر پسپا کیا۔ پھر اس سے بھی زیادہ غم ناک پہلو مسلمانوں کی فکری و نظریاتی پسپائی تھی۔ مسلمان مغرب کے شمشیر بکف حملہ آوروں کے سامنے سرنگوں ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تحقیق کے میدانوں میں بھی شکست خوردہ ہو گئے۔

یورپی اقوام مادی فتح کے ساتھ فکری میدانِ کار زار میں بھی کود پڑیں اور خالص دینی موضوعات کو تختۂ مشق بنانے کے لیے مسلمانوں ہی کی صفوں سے بھی اپنی 'فوج' بھرتی کرنا شروع کی۔ ان معاندانہ کوششوں کا ہدف نمایاں طور پر سیرتِ رسولؐ اور جہاد تھا اور ہے۔ ان کا مدعا یہ رہا ہے کہ ''اسلام کو تمام تر غلبہ تلوار کے زور پر ملا ہے اور اسلام خون ریزی سکھاتا ہے''۔ اس نوع کے اعتراضات کا تعلق چوں کہ زیادہ تر سیرت پاکؐ سے تھا، اس لیے مغربی مصنّفین نے بڑے اہتمام سے اس موضوع پر لکھا۔ ۱۸۶۱ء میں لندن سے ایسے اعتراضات پر مبنی ایک ضخیم کتاب *The Life of Mahomet* ●، سر ولیم میور (۱۸۱۹ء-۱۹۰۵ء) نے لکھی، جو اس وقت یو پی کے

○ متعلّم شعبہ سیاسیات، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

● اس کتاب پر ایک طبقے نے تحسینی بیانات دیے، تاہم معاصرین کا یہ ردعمل بھی ملاحظہ کیجیے: ● لندن کے معروف روزنامے *Times* (۱۵ نومبر ۱۸۸۳ء، ص ۲) نے تبصرہ کیا: ''یہ کتاب محض عیسائی کینہ پروری اور عمومی نفرت انگیزی کی نشرواشاعت ہے''۔ ● اوکسفرڈ یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر ڈیوڈ سیموئیل مارگولیتھ (۱۸۵۸ء-۱۹۴۰ء) کے بقول: ''یہ ایک اعتراف شدہ متعصّبانہ تحریر ہے''۔ (محمد اینڈ رایز آف اسلام، ۱۹۰۵ء) ● سیّد امیر علی (۱۸۴۹ء-۱۹۲۸ء) کے مطابق: ''میور، اسلام کا تسلیم شدہ دشمن ہے''۔ (اسپرٹ آف اسلام، لندن، ۱۸۹۱ء)۔ ادارہ

لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر یورپی ذہن کی جانب سے ایک 'چارج شیٹ' کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کتاب میں لگائے گئے الزامات سے مسلمان بہت بے چین ہوئے۔ تاہم، اس کتاب کا اوّلین جواب دینے کی رضاکارانہ ذمہ داری سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے لی۔ اور اس مقصد کے لیے سرسیّد ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے۔[۲] ولیم میور کی کتاب کی پہلی جلد کا جواب کتاب کی صورت میں مرتب کر کے ۱۸۷۰ء میں لندن ہی سے انگریزی ایڈیشن *Eassays on the Life of Muhammad* شائع کی۔[۳] لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب میں جہاد سے متعلق مباحث سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا گیا (ویسے بھی ولیم میور نے اپنی کتاب کی تیسری اور چوتھی جلدوں میں جہاد کے متعلق مباحث چھیڑے ہیں)۔ بعض مقامات پر اس حوالے سے ضمنی باتیں مل جاتی ہیں۔ اسلام پر جبر و اکراہ کے الزام کے جوابات دیے ہیں۔

لیکن جنابِ سرسیّد احمد کا اسلوبِ بیان مستشرقین سے ملتا جلتا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں۔ اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں، بلاشبہہ اسلام نے بھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے، یعنی خدا پرستوں کے امن اور ان کی جان و مال کی حفاظت اور ان کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو، اور یہ ایک ایسا منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص کسی قسم کا الزام نہیں لگا سکتا''۔[۴]

یہ وہی اسلوب ہے جس سے عموماً مستشرقین، انبیا کرامؑ کی گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سرسیّد نے پوری کتاب میں الزامی جواب دینے کے لیے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے برعکس الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء- ۱۹۱۴ء) خطباتِ احمدیہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسیّد نے اس کتاب میں مناظرہ کے اس مخاصمانہ طریقے کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریقِ مخالف کے دل میں بجاے رغبت کے نفرت اور بجاے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے، ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصّبانہ طریقہ

اختیار کیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔[۵]

جناب الطاف حسین حالی کی یہ محض ایک غیر محتاط اور غیر منصفانہ دلیل ہے۔ اگرچہ سرسیّد کا بنیادی مقصد 'ولایت' [تاج برطانیہ] کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کرنے کے لیے بہت سی معذرتیں پیش کرنا تھا۔ سرسیّد خطباتِ احمدیہ کی اشاعت کے بعد ۲۷ سال تک زندہ رہے، لیکن معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے ولیم میور کی بقیہ تین جلدوں کا جواب کیوں نہ لکھا۔ تاہم، سیرتِ نگاری پر سرسیّد کے افکار نے بعد کے اہلِ قلم پر بہت گہرے نقوش چھوڑے۔ اس دور میں اس قافلے کے آخری نقیب مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء- ۱۹۱۴ء) تھے۔ ولیم میور کی جانب سے جہاد پر اعتراضات کا تفصیلی جواب مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء-۱۸۹۵ء) کے حصّے میں آیا، اور انھوں نے تحقیق الجہاد[۶] کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ جب ۱۸۷۰ء میں سرسیّد ہندستان واپس آئے، تو اسی سال دونوں کی ملاقات ہوئی۔ سرسیّد نے اس سے قبل ۱۸۶۴ء میں غازی پوری میں 'سائنٹی فک سوسائٹی' قائم کی، جس کا بنیادی مقصد مغربی علوم کو اردو زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ چراغ علی صاحب چوں کہ زبانوں میں کافی مہارت رکھتے تھے، اس لیے مذکورہ ملاقات کے بعد سرسیّد نے ترجمے کے منصوبوں کی ذمہ داری ان پر ڈالی۔ منصوبہ ترجمہ کے مالی اخراجات ریاست حیدرآباد دکن برداشت کرتی تھی۔ اس لیے بعدازاں سرسیّد کی تجویز پر چراغ علی صاحب ریاست حیدرآباد میں کئی اہم مناصب پر فائز رہے۔ دونوں کی رفاقت بہت مضبوط تھی۔[۷]

چراغ علی صاحب نے اپنی کتاب تحقیق الجہاد کو بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ سرسیّد کے نام منسوب کر کے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا۔ تاہم، انگریزی اشاعت کے بعد چراغ علی صاحب نے سرسیّد کو کتاب کا اردو ترجمہ کرنے میں مدد طلب کی۔ سرسیّد نے جواب میں لکھا کہ: ''اُردو میں اس کی اشاعت مناسب نہیں ہے، کیوں لوگ آپ کے مقصد کو نہیں سمجھیں گے۔ علی گڑھ میں پہلے سے آپ کے خلاف مخاصمانہ ماحول پیدا ہو چکا ہے اور حیدرآباد کے لوگ علی گڑھ والوں سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔ اگر اردو میں اس کی اشاعت ہوگئی، تو آپ کے خلاف نفرت کی زہریلی فضا قائم ہوجائے گی''۔[۸] خواجہ غلام الثقلین نے اس کتاب کا اردو ترجمہ ۱۹۱۳ء میں کر کے پانی پت سے

شائع کیا۔ اس بحث سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ چراغ علی صاحب کی کتاب دراصل اس سلسلے کی کڑی تھی، جس کا آغاز سرسیّد احمد خاں نے کیا تھا۔[۹]

تحقیق الجہاد کا بنیادی مقدمہ یہ تھا کہ: 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی جنگیں لڑی تھیں وہ تمام دفاعی تھیں'۔ اس خطے میں چراغ علی صاحب پہلے آدمی ہیں، جنھوں نے 'دفاعی' اور 'اقدامی جہاد' کی تقسیم متعارف کرائی، جس کا اثر بعدازاں اکابر سیرت نگاروں تک کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے شبلی نعمانی بھی اپنی معرکہ آرا کتاب سیرت النبیؐ میں 'دفاعی' اور 'اقدامی' اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، اور وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا تجزیہ کرتے ہیں، تو ان کے نزدیک تمام جنگیں دفاعی ہیں۔ مختصراً عرض ہے کہ جہاد کے حوالے سے یہ تقسیم اسلامی قانون سے قریب نہیں ہے۔

سرسیّد صاحب نے اپنے رفقا کے ہمراہ مغرب کو جواب تو دے دیا، لیکن اپنی صفائی بحیثیت مجرم کے پیش کی۔ اہلِ مغرب نے یہ اعتراض کیا کہ ''اسلام تلوار کی طاقت سے پھیلا ہے'' تو ان حضرات نے سرے انکار کر دیا کہ ''اسلام اور تلوار کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے''۔ اسی طرح وہ تمام نزاعی مسائل زیرِ بحث آئے، جو آج بھی زندہ موضوعات ہیں۔ اسیرانِ جنگ، غلامی، مالِ غنیمت، متحارب اور مفتوح اقوام سے تعلق، جزیہ کی وصولی اور اس نوع کے تمام مسائل میں سرسیّد کی فکری روایت اس وقت سے تاحال دوراز کار تاویلات میں مصروف کار ہے۔

اس مختصر پس منظر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاد کے مسئلے پر اس خطے میں یہ ایک نئی فکر پروان چڑھی۔ ایک جانب اہل مغرب کا تعصب تھا اور دوسری جانب معذرت خواہ اہل قلم۔ اس گھٹاٹوپ ماحول میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) پہلے آدمی ہیں، جنھوں نے بغیر کسی معذرت خواہی کے، مخالفین کے اتہامات کا جواب دیا۔ اس موضوع پر مولانا مودودی کی معرکہ آرا کتاب کا پس منظر ایک واقعہ بنا۔

۲۰ویں صدی کے آغاز میں ہندوؤں کی بعض تحریکیں اٹھیں جن کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو تہذیبی اور سماجی سطح پر کمزور کرنا تھا۔ انھی میں سے ایک 'شدھی تحریک' بھی تھی۔ یہ تحریک اس نظریے کی بنیاد پر بنی کہ ہندستان کے لوگ دراصل ہندو ہیں۔ اس لیے جو لوگ دوسرے مذاہب پر

ایمان لائے ہیں، ان کو دوبارہ شدھی بنا دینا چاہیے۔[۱۰] اس مقصد کے لیے 'شدھی تحریک' نے مختلف طریقے اختیار کیے، اور آخر کار نسل پرست برہمن کھلی دشمنی پر اتر آئے۔ بالآخر مسلمانوں کو جبراً ہندو بنانا شروع کیا۔ یہ دشمنی اس حد تک بڑھ گئی کہ شدھی تحریک کے لیڈروں نے ایک قدم آگے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں کھلم کھلا گستاخیاں شروع کر دیں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو اس تحریک کے بانی سوامی شردھانند (۱۸۵۶ء-۱۹۲۶ء) کو عبدالرشید نامی ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔[۱۱] اس سے مسلمانوں کے خلاف ماحول ابتر ہو گیا۔ ایک بار پھر ہندوؤں نے اسلام اور مسلمانوں کو مطعون کرنے کا آغاز کیا۔ مظاہروں سے ہندستان کے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ تاہم، تصورِ جہاد ایک بار پھر جلسوں اور اخباروں میں اعتراضات کی زد میں آ گیا۔ اس بار ہندوؤں کی نفرت اور تعصب نے ایسی شدت اختیار کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے بڑے دانش ور بھی اس سے بچ نہ سکے۔

گاندھی جی (۱۸۶۹ء-۱۹۴۸ء) جو بڑے صائب الرائے آدمی تصور کیے جاتے تھے، انھوں نے اپنی نفرت کا اظہار سوامی کے تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اس طرح کیا کہ:

''عبدالرشید اس قتل کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ذمہ دار ہیں جنھوں نے نفرت پھیلا کر اس کو قتل پر اُکسایا۔[۱۲] اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے، جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے''۔[۱۳] اخبار الجمیعۃ (۱۹۲۷ء) کے اداریوں سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ فساد پرور ہندو اس وقت کس قسم کا زہریلا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔

سیّد مودودی لکھتے ہیں: ''ہندوؤں نے اس سلسلے میں جو رکیک اور غلط پروپیگنڈا شروع کیا ہے، اس میں ایک طرف تو ان کے لیڈر گورنمنٹ کو دھمکی دے رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو مرعوب کرنا اور خوف دلانا چاہتے ہیں۔ ہندو اخبارات نے جو روش اختیار کی ہے اور ماتمی جلسوں میں جو زہریلی تقریریں کی جا رہی ہیں، وہ نہایت خطرناک اور امن سوز ہیں۔ جہاں تک اظہارِ غم اور ہمدردی کا معاملہ ہے، [تو] اظہارِ ماتم کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ ایک مرتکب جرم کے ساتھ (جو ابھی تک متحقق نہیں کہ کون ہے) ساری مسلمان قوم کو موردِ طعن و تشنیع بنایا جائے، بلکہ اس پر بھی قناعت نہ کر کے مذہب اسلام کے خلاف بھی سب و شتم کا بازار گرم کر دیا جائے۔ سڑکوں پر سرِ راہ

بھجن گاتے پھرنا اور ماتمی جلسوں میں مساجد پر اوم [ایشور] کے جھنڈے گاڑنے کا اعلان کرنا، تمام مسلمانوں کے شدھ [پاک] کرنے کا ارادہ ظاہر کرنا، مسلمانوں سے داڑھی منڈانے اور چوٹی رکھوانے کا مطالبہ کرنا، ہندو جاتی [ہندو قوم] کے نوجوانوں کو مرنے کے لیے تیار کرنا، یہ آخر کون سی تہذیب و شائستگی ہے؟[۱۴]

[الجمعیۃ، ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء ہی میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:] ''ایک مہاشہ صاحب کے ارشادات ملاحظہ ہوں، جو ۷ جنوری کے [اخبار] تیج میں شائع ہوئے ہیں: '۱۸ویں صدی کے آخری دس سالوں میں مختلف یورپین ممالک کے رہزن، قزاق، لٹیرے، جانباز ڈاکو، لچے، لفنگے، شہدے، شاہین چور، حرام زادے جنھیں اخلاق و شائستگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا، مہلک و تباہ کن آلات اور سمیات سے مسلّح ہوکر اپنے اپنے گھروں سے چل کر ایشیا میں وارد ہوئے۔ انھوں نے کمزور اقوام کو تباہ کیا اور اپنے حلقۂ غلامی میں لاکر ان کے ممالک میں لوٹ مار مچادی، سیاسی جرائم کا ارتکاب کیا، ان کی نظیر صفحہ تاریخ میں مسلم غنڈا پن اور ظلم و سفاکی کے سوا اور کوئی نہیں ملتی ہے۔ عرب کے وحشی بربریوں کے گروہوں کے گروہ جو محمد صاحب کے جانشینوں کی فتوحات کے نشوں سے سرشار و سرمست تھے، زیادہ اراضی پر قابض و متمکن ہونے اور نئی چراگاہوں پر متصرف ہونے کی حرص میں ہاتھوں میں قرآن و تلوار لیے ہوئے ایران اور ہندستان کے فی مابین علاقے کو ٹڈی [دَل] کی طرح برباد کرنے کے لیے چڑھ دوڑے تھے اور سَبھیتا [تہذیب] جو کہ دو ہزار سالوں سے چلی آتی تھی، ایسے وحشی و سفاک بربریت مجسم دشمن سے دوچار ہوئی، جس کو ہنر و فنون لطیفہ، لٹریچر یا حُسن و خوبی کی قدر نہیں تھی۔ اس دشمنِ انسانیت عدو کا نعرہ جنگ، تباہی و بربادی ہی تھا۔ ہندستان میں داخل ہوکر ان بدباطن بربریوں نے بودھوں کے مَٹھوں [تعلیمی مراکز] اور دھرم اَستھانوں [مندروں] کو ملیامیٹ کردیا۔ تعلیم کے مراکز غنڈا گردی و شہدے پن کے مرکزوں میں تبدیل ہوگئے۔ بھارت ورش [ہندستان] نے بودھ اُتم دھرم [اعلیٰ بدھ مذہب] کھو دیا اور بودھ پرجا [عوام] کو لاکھوں کی تعداد میں جبراً عرب کے دین میں تبدیل کیا گیا۔ اس وقت ہندستان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا، مگر آج سات کروڑ مسلمان ہیں''۔[۱۵]

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''ممکن ہے اس تحریر کو ایک شخصی تحریر کہا جائے، لیکن لاہور کے اخبار

سوراجیہ کی اس تحریر کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو کسی شخص کا ذاتی اخبار نہیں بلکہ [انڈین نیشنل] کانگریس کی سرپرستی میں نکل رہا ہے: مسلمانانِ ہند کی تواریخ کسی بھی پہلو میں شان دار نہیں، نہ انھوں نے کوئی فلاسفر پیدا کیا ہے اور نہ ہی کوئی سائنس دان، نہ کوئی حقیقی دھرماتما [فیاض] اور نہ ہی کوئی جاں باز محب وطن، بلکہ وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنی بربریت اور وحشیانہ پن کا ہی ثبوت دیا ہے اور اس کا واحد کارن [مقصد] ان کا مذہبی کٹرپن، عدمِ رواداری، تنگ دلی اور غلط خیالات ہیں''۔[16]

ان حالات میں جس تصور کے خلاف سب سے زیادہ پروپیگنڈا کرایا گیا، وہ جہاد ہے۔ برطانوی ہند کے طول و عرض میں اسی زبان میں آگ کے شعلے بلند کرتے اور لاوا اُگلتے پروپیگنڈے کی زد میں اسلام اور مسلمان تھے۔

انھی دنوں مولانا محمد علی جوہرؔ (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء)[17] نے جامع مسجد دہلی میں خطبہ دیتے ہوئے حسرت سے کہا: '' کاش! کوئی بندۂ خدا اس وقت اسلامی جہاد پر ایسی کوئی کتاب لکھے، جو مخالفین کے سارے اعتراضات والزامات کو رفع کر کے جہاد کی اصل حقیقت دنیا پر واضح کر دے''۔[18]

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ: ''تقریر سننے والوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں جب وہاں سے اٹھا تو یہ سوچتا ہوا اٹھا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کروں''۔ مولانا جوہرؔ کی اس آرزو نے سیّد مودودی کو مہمیز دی اور اس موضوع پر لکھنے کا آغاز کیا۔ سیّد مودودی ان دنوں جمعیت العلما کے سہ روزہ اخبار الجمیعۃ، دہلی کے ایڈیٹر تھے، اور روزِ اول (دسمبر ۱۹۲۴ء) سے دسمبر ۱۹۲۸ء تک ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔[19]

اسی پرچے میں اسلامی قانونِ جنگ پر مولانا مودودی نے یہ سلسلہ وار مضامین بہ عنوان 'کیا اسلام خوں ریزی سکھاتا ہے؟' لکھنا شروع کیا، تو جمعیۃ العلما کے ناظم مولانا احمد سعید نے، اس سلسلہ تحریر کے تعارف میں یہ سطور قلم بند کیں: ''دنیا میں حقیقی امن وصلح کا پیغام اگر کوئی مذہب لایا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ مگر عداوت اور بغض کا بُرا ہو کہ اس نے مخالفین اسلام کی آنکھوں کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ اُن کو یہ روشنی نظر نہیں آتی، اور وہ برابر اسلام کی تعلیم کو خونی تعلیم اور اسلام کو خونی مذہب کہتے ہیں۔ مخالفین اسلام کے غلط پروپیگنڈے کی قلعی کھولنے اور اسلام کی حقیقی اور سچّی تعلیم کو واضح کرنے کے لیے جمعیۃ العلما کے اخبار الجمیعۃ میں ایک پُراز معلومات سلسلۂ مضامین شروع

کیا جارہا ہے، جو مخالفین کے لیے مشعلِ ہدایت اور مسلمانوں کے لیے بصیرت کا ذریعہ ہوگا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ صلح و جنگ کے احکام کو صحیح اسلامی تعلیم کے مطابق پڑھیں اور سمجھیں اور ہندستان کے تمام قومی و مذہبی معاملات میں سچی رہنمائی سے مستفید ہوں، تو فوراً ۲ فروری ۱۹۲۷ء سے اخبار الجمیعۃ کو التزام سے پڑھیے اور اپنے احباب و اقربا کو پڑھائیے اور سُنائیے۔ ہر مسلمان کا قومی اور مذہبی فرض ہے کہ حق کی اس آواز کو دوسرے مسلمانوں تک پہنچادے۔ بالخصوص اس وقت ائمہ مساجد کی اسلامی خدمت یہی ہے کہ جمعہ کے روز الجمیعۃ کے مضامین مسلمانوں کو سنا کر اُن میں اسلامی تعلیم کی سچی واقفیت پیدا کریں، تاکہ وہ عام مسلمانوں کا طبقۂ مخالفین کی تلبیس کی مضرتوں سے محفوظ رہے۔ الجمیعۃ کی توسیع اشاعت بھی طریقِ حق میں سے ایک مفید اور نتیجہ خیز طریقہ ہے''۔[۲۰]

جب الجمعیۃ میں ۲۳، ۲۴ قسطیں چھپ چکیں تو اندازہ ہوا کہ اتنے بڑے موضوع کو اخباری صفحات پر نبھانا ممکن نہیں۔ اس لیے مولانا مودودی نے اقساط کی اشاعت روک دی۔[۲۱] اور پھر اس سلسلۂ مضامین کو مفصل مباحث کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کر کے دارالمصنّفین کے سپرد کیا۔ بالآخر یہ مضامین علّامہ سیّد سلیمان ندوی [۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء] کے تجویز کردہ عنوان الجہاد فی الاسلام کے تحت ۱۹۳۰ء میں وہیں سے شائع ہوئے۔ سیّد مودودی نے دارالمصنّفین کے سامنے بعض شرائط رکھی تھیں، جس کا ذکر سیّد سلیمان ندوی نے مجلس دارالمصنّفین کے رکن مولانا عبدالماجد دریابادی سے ایک خط میں کیا: ''ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اسلام اور جنگ پر سلسلۂ مضمون لکھا تھا اور الجمیعۃ میں شائع ہوا تھا، اس موصوف نے مع اضافہ ابواب کثیر تین ساڑھے تین سو صفحوں کی ایک کتاب لکھی ہے، جو معیار کے مطابق اور پُرمعلومات ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کو دارالمصنّفین شائع کرے اور اس کے معاوضے میں وہ ان کو دائمی رکن بنائے اور اپنی مطبوعات سالانہ معارف ان کو دیا جائے''۔[۲۲]

دسمبر ۱۹۲۹ء کے معارف میں الجہاد فی الاسلام کے بارے مولانا سیّد سلیمان ندوی نے لکھا: ''دارالمصنّفین سے امسال زیرِطبع ایک کتاب اسلام اور اس کے قوانینِ جنگ ہے، جس میں اسلام کی رواداری، جہاد اور اس کے اسباب و اغراض دوسری قوموں کے حقوق، ان سے لڑائی اور صلح کے احکام، دوسرے مذاہب اور موجودہ متمدن حکومتوں کے قوانینِ جنگ سے مقابلہ اور

موازنہ، یہ کتاب شاید ۵۰۰ صفحات پر ختم ہو۔ آدھی سے زیادہ چھپ چکی ہے۔ شاید دو مہینے میں پوری ہو سکے''۔ [۲۳]

کتاب کی اشاعت کے بعد ماہ نامہ معارف کے مدیر جناب سیّد سلیمان ندوی، الجہاد فی الاسلام کے مختصر تعارف میں لکھا: ''سالِ گذشتہ کی طرف سے اس مہینے جو نئی کتابیں چھپ کر تیار ہو رہی ہیں، ان میں تیسری کتاب کا نام الجہاد فی الاسلام ہے، اس کے مؤلف ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔ تقریباً ۵۰۰ صفحات میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے۔ اس میں اسلامی جہاد کے اصول و مسائل، معترضین کے جوابات، مخالفین کے شکوک و شبہات کی تردید، یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور بودھوں کے اصول سے ان کا مقابلہ اور یورپ کے موجودہ قوانینِ جنگ پر تبصرہ اور جہاد کے اسلامی قوانین سے ان کا موازنہ ہے۔ عربی اور انگریزی کی بہترین مستند کتابوں کے حوالوں سے یہ لکھی گئی ہے۔ خیال ہے کہ اس ضروری مسئلے پر اس سے زیادہ مدلل، مبرہن اور مبسوط کتاب اب تک نہیں لکھی گئی''۔ [۲۴]

ہندستان کے مشاہیر اہل علم وفکر میں اس کتاب نے خوب پذیرائی حاصل کی۔ علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) نظریۂ جہاد میں دل چسپی رکھتے تھے اور اہل قلم کو اس موضوع پر لکھنے کے لیے اُبھارتے رہتے تھے۔ [۲۵] جب الجہاد فی الاسلام ان تک پہنچی تو فرمایا:

'اس [کتاب] کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا، بلکہ جنگ و جہاد کے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں، اُنھیں کسی تاویل یا تعبیر کے بغیر، بڑے کرّ وفر سے پیش کیا ہے'۔ [۲۶]

دارالاسلام کے منصوبے کے لیے سیّد مودودی کے انتخاب کا ذریعہ بھی یہ کتاب بنی تھی:

سید نذیر نیازی (م: ۱۹۰۰ء-۱۹۸۱ء) راوی ہیں کہ علامہ [محمد اقبال] نے چودھری نیاز علی خاں [۱۸۸۰ء-۱۹۷۶ء] سے 'دارالاسلام' کے 'مردکار' کی فراہمی کے بارے میں کہا:

'حیدرآباد [دکن] سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انھیں 'دارالاسلام' آنے کی دعوت دیں۔

میرا خیال ہے وہ دعوت قبول کرلیں گے'۔ [۲۷]

جن حضرات کو اس زمانے میں کتاب پڑھنے کا موقع ملا، ہر کسی نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ مثال کے طور پر رئیس احمد جعفری [۱۹۰۸ء-۱۹۶۸ء] لکھتے ہیں: ''بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار و دماغی زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں جمعیۃ العلما کے ترجمان الجمعیۃ کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی اور اسے بام عروج پر پہنچایا، ہندستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اوّل میں پہنچادیا، سوامی شردھانند کے [واقعۂ] قتل کے بعد جس نے 'اسلام اور تشدد کا مسلک' کے موضوع پر اتنے عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی، مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہوگئے''۔ [۲۸]

سیّد مودودی لکھتے ہیں: ''میں نے جب دنیا میں آنکھیں کھولیں، تو ایک خاص مذہبی ماحول میرے سامنے تھا، جس کی بہت سی چیزیں مجھ کو اپیل نہیں کرتی تھیں۔ خوش قسمتی سے میری ابتدائی تعلیم عربی زبان ہی میں ہوئی تھی اور اسلامی علوم کی ابتدائی کتابیں میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ جب میں قرآن اور حدیث کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہوں تو مجھے جاننا چاہیے کہ وہ اسلام کیا ہے جو قرآن و حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس مطالعے کے دوران میں مَیں نشان بھی لگاتا گیا اور نوٹس بھی لیتا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام فی الواقع کیا ہے؟ اس مطالعے نے تفصیلی اور تحقیقی شکل اس وقت اختیار کی جب میں نے الجہاد فی الاسلام لکھنی شروع کی''۔ [۲۹]

یہ وہ تصنیف ہے جس نے خود سیّد مودودی کے اندر انقلاب برپا کیا اور انھوں نے صحافت کو خیر باد کہہ کر احیاے اسلام کے لیے جدوجہد شروع کی، جس نے بعد میں جماعت اسلامی کو وجود بخشا۔ جسٹس ملک غلام علی [۱۹۲۰ء-۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء] کے بقول الجہاد فی الاسلام کے بارے میں سیّد مودودی نے ایک مرتبہ خود فرمایا: ''اس کتاب نے سب سے زیادہ فائدہ خود مجھے پہنچایا ہے۔ میں نے جب اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا، تو میرے اندر دینی حمیت سے زیادہ قومی حمیت کا جذبہ کام کر رہا تھا، لیکن تالیف و تحقیق کے دوران میں جب مجھے ایک ترتیب کے ساتھ اسلام کے اساسی نظریات اور اس کے تفصیلی احکامات کا غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں نہ صرف نظامِ شریعت کا فہم اور اس کی حقانیت کا غیر متزلزل یقین اُبھر آیا، بلکہ

اس نظام کے احیا کا ولولہ بھی مجھ میں پیدا ہوگیا اور اس کے لیے کام کرنے کا طریقہ بھی میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد میں نے اخبارنویسی کے مروج اور پامال راستے کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی۔ الجمیعۃ سے علیحدگی اختیار کرلی اور یہ طے کیا کہ صحافت کی دنیا میں اگر آیندہ قدم رکھوں گا، تو صرف اس شرط پر، کہ اسے دینِ حق کی خدمت کا ذریعہ بناؤں۔ اس کے بعد مزید پانچ سال تک پھر صرف مطالعہ، لکھنے پڑھنے اور اپنی علمی استعداد بڑھانے کا کام کرتا رہا''۔ [۳۰]

اس شاہکار تصنیف نے بے شمار لوگوں کی زندگیاں سنواری ہوں گی۔ یہاں ہم صرف جناب شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء-۲۵/اکتوبر ۱۹۷۵ء) کے احوال نقل کر رہے ہیں جو مجلس احرار کے رہنما کی حیثیت سے ساہیوال سنٹرل جیل میں قید تھے۔ ان کے ساتھ بعض معروف کمیونسٹ لیڈر بھی اسیر تھے۔ شورش صاحب لکھتے ہیں: ''میں نے [جیل ہی میں] مختلف پروفیسروں سے کمیونزم پڑھنا شروع کیا۔ دو سال تک پڑھتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ میری ذہنی بنیادیں ہل گئیں۔ میں خدا کے وجود سے لے کر عام اخلاقی اقدار تک کے عقیدے میں ڈانواں ڈول ہوگیا۔ میں نے قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ترک کردی، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ مطلب جانے بغیر اس کی تلاوت بے فائدہ ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ کو (نعوذ باللہ) فرصت کے قہقہوں کا موضوع سمجھتا تھا۔ اور ہر اس مسئلے کی تضحیک میں خوشی ہوتی، جو مذہب کے 'غیر عقلی' وجود سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مجھے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک ضخیم تصنیف الجہاد فی الاسلام بھجوائی۔ میں نے سرورق دیکھا اور کتاب کو سرہانے رکھ چھوڑا۔ کچھ دنوں بعد میرا [سنٹرل] جیل خانے کے سپرنٹنڈنٹ سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے تنہائی میں بھیج دیا اور مارکسزم کے موضوع کی تمام کتابیں روک لیں۔ میں نے اصرار کیا، لیکن وہ نہ مانا۔ جب دو چار دن بے مطالعہ تنہائی میں گزر گئے تو میں نے محض دفع الوقتی کے لیے الجہاد فی الاسلام طلب کی۔ سپرنٹنڈنٹ ہندو تھا، اس لیے مذہبی کتاب سمجھ کر بھیج دینے پر راضی ہوگیا۔ میں نے تین دن میں تمام کتاب پڑھ ڈالی۔ یہ مطالعہ آنکھوں کی مشغولیت تک محدود رہا۔ دماغ میں اس کا ایک دھندلا سا نقش ہی قائم ہوسکا، البتہ دل نے ایک لطیف اثر قبول کیا۔ اب میں نے کتاب کے ۲۰ صفحے بلا ناغہ پڑھنا اور ان پر اپنے فہم کے مطابق سوچنا شروع کیا۔ جب میں کتاب ختم کر چکا، تو مجھے اپنے دماغ و دل میں حیرت انگیز تبدیلی

محسوس ہوئی۔ میں نے قیدِ تنہائی سے نکلتے ہی کمیونزم اور سوشلزم کے معلّمین سے بحث و مذاکرہ شروع کر دیا۔ جب وہ میری زبان سے اسلام کی تصریحات سنتے، تو اپنے سوالات بھول جاتے اور انھیں حیرت ہوتی کہ اسلام کا مفہوم مروجہ اصطلاحِ مذہب سے کتنا مختلف ہے''۔[۳۱]

معلوم نہیں کتنے اور گُم نام لوگ ہوں گے، جن کی زندگیاں اس تصنیف کی بہ دولت اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوں گی۔ تاہم، استعماری دور میں مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس ذہنی ارتداد سے گزر رہا تھا، اس طبقے کو سیّد مودودی کی غیر معمولی طاقتِ انشا نے ان نازک حالات میں بہت بڑا سہارا دیا۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ سیّد مودودی سے قبل، ہندستان میں جتنے اہلِ قلم نے جہاد پر قلم اٹھایا، ان تمام نے اپنا مقدمہ مجرم کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر اپنی صفائی پیش کی۔ ہر ایک نے معذرت خواہی اختیار کی۔ سیّد مودودی کے بارے میں بہت واضح ہے لیکن علامہ اقبال نے بھی وہ شہادت دی ہے کہ یہ ایسی تصنیف ہے جو عذر خواہی سے پاک ہے۔ استادِ محترم جناب ڈاکٹر محمد مشتاق احمد کی روایت ہے کہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (۱۹۳۲ء-۲۰۱۶ء) کہا کرتے تھے کہ: ''سیّد مودودی جہاد کے بارے میں غلط فہمیاں ختم کرنے نکلے تھے لیکن کمال یہ ہے کہ عذر خواہی سے بالکل احتراز کیا''۔ بلاشبہہ یہی اس تصنیف سے سب سے بڑی خوبی ہے۔

حواشی

۱- مولانا شبلی نعمانی کے دور تک مستشرقین کی جتنی کتابیں منظرِ عام پر آئی تھیں، ان کی فہرست مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ میں دی ہے۔ سیرت النبیؐ، شبلی نعمانی، (اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۷۴ء)، ج۱، ص ۹۲-۹۵

۲- انگلستان کے سفر کا ایک مقصد اس کتاب کا جواب دینا بھی تھا۔ اس کتاب کو لکھنے میں انھوں نے بہت صعوبتیں اٹھائیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مولانا الطاف حسین حالیؔ، حیاتِ جاوید (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء)، حصّہ دوم، ص ۱۲۰-۱۱۹۔ اس کتاب کی تفصیلی روداد کے لیے دیکھیے: مسافرانِ لندن، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی [۱۸۹۳ء-۱۹۷۲ء] (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)۔

۳- سرسیّد نے کتاب خطباتِ احمدیہ اردو میں لکھی تھی۔ اس کو آپ کے صاحبزادے جسٹس سیّد محمود [۱۸۵۰ء-۱۹۰۳ء] نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، دیکھیے: The New Encyclopedia Britannica، جلد اوّل (یونی ورسٹی آف شکاگو، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۶۴

۴- خطباتِ احمدیہ بہت بعد (۱۸۸۷ء) میں شائع ہوئی۔ یاد رہے ولیم میور کی کتاب کا پہلے انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا، یعنی سرسیّد کے پڑھنے کا اصل ماخذ فارسی کتاب تھا۔ثریا حسین، سرسیّد احمد خان اور ان کا عہد، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۱۳۔ سرسیّد کی انگریزی زبان سے ناواقفیت کی شہادت خطباتِ احمدیہ میں بھی مذکور ہے۔ دیکھیے: سرسیّد احمد خان، خطباتِ احمدیہ، (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۴ء)

۵- خطباتِ احمدیہ، ص ۲۲۵

۶- حیاتِ جاوید، حصّہ دوم، ص ۱۲۵۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر الزامی جواب کے طور پر جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی نازیبا ہے۔ اصل میں یہ کتاب چراغ علی نے انگریزی میں اس عنوان سے لکھی: A Critical Exposition of Popular Jihad، (کلکتہ: تھیکر سپنک اینڈ کمپنی، ۱۸۸۵ء)

۷- چراغ علی کی وفات پر سرسیّد نے بہت گہرے غم کا اظہار کیا تھا۔ ملاحظہ ہو: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مقالاتِ سرسیّد، (کلب روڈ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ص ۸۱۷

۸- سرسیّد احمد خان، مکتوبات، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۷۰

۹- مزید دیکھیے: وحید الرحمان، The Religious Thought of Moulvi Chiragh Ali، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے (مانٹریال: میک گل یونی ورسٹی، ۱۹۸۲ء)

۱۰- اس کا لفظی مطلب ہے پاک کرنا، یعنی جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں انھیں دوبارہ ہندو بنا کر پاک کرنا۔

۱۱- عبدالرشید کے متعلق سیّد مودودی کے الجمیعۃ ۱۹۲۷ء کے مضامین میں تفصیل موجود ہے۔ جنھیں مضامین جناب خلیل احمد حامدی [۱۹۲۹ء- ۲۴ نومبر ۱۹۹۴ء] نے آفتابِ تازہ کے نام سے مرتب کیا ہے: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، آفتابِ تازہ، (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۹۳ء)۔ سیّد مودودی نے لکھا ہے کہ: اس وقت تمام مسلمان زعما نے سوامی جی کے قتل کی شدید مذمت کی تھی، لیکن ہندوؤں نے اسی روز مجنونانہ انتقام لے لیا، اور مسلمانوں پر حملہ کر کے پانچ لوگ زخمی کیے۔ ایک غریب مسلمان مفتی محبوب علی کو شہید کر دیا۔ (آفتابِ تازہ، ص ۲۳)۔ عدالت نے مفتی محبوب علی کے قتل میں گرفتار ملزمان کو رہا کر دیا (ایضاً، ص ۱۱۷) ہندوؤں نے بار بار یہ الزام لگایا کہ سوامی جی کو مسلمانوں نے ایک سازش کے تحت قتل کر دیا ہے لیکن وہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے، بالآخر عبدالرشید کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی جانب سے خرابی دماغ کا عذر پیش کیا گیا، جس کو کسی تحقیقات نے غلط ثابت نہیں کیا (ایضاً، ص ۶۷)

۱۲- وی جی ڈیسائی، A Gandhi Anthology Book، اوّل، (احمد آباد: نواجیون پبلشنگ، ہاؤس،

۱۹۵۸ء)، ص ۱۲

۱۳- 'سیّد ابوالاعلیٰ مودودی'، الجہاد فی الاسلام، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۳۰ء)، ص ۸؛ محمد یوسف بُھٹہ، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں (لاہور: ادارہ معارفِ اسلامی، طبع دوم، مارچ ۱۹۸۴ء)، ص ۲۵۱

۱۴- 'ہندوؤں کا امن سوز پروپیگنڈا'، سیّد مودودی، الجمیعۃ، ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء، بہ حوالہ آفتابِ تازہ ص ۲۵

۱۵- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، آفتابِ تازہ، مرتبہ: خلیل احمد حامدی، ص ۲۷

۱۶- ایضاً، ص ۲۸

۱۷- ہندوؤں نے مولانا محمد علی جوہرؔ کے خلاف بھی خوب پروپیگنڈا کیا کہ عبدالرشید کو اُکسانے میں وہ بھی شریک ہیں، سیّد مودودی نے الجمیعۃ، ۲۲ جنوری ۱۹۲۷ء میں اخبار ارجن کے مضمون کا حوالہ دیا ہے: گذشتہ چھے ماہ میں دہلی کے مسلمان اخبارات نے سوامی جی کے برخلاف حد درجہ کا زہریلا اندولن جاری رکھا۔ یہاں تک کہ مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد نے بھی سوامی جی کے برخلاف مسلمانوں کو خوب بھڑکایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی متعصب مسلمانوں کا یہ وشواس ہوگیا کہ سوامی جی کا قتل کرنا ثواب کا کام ہے''۔ (آفتابِ تازہ، ص ۳۹)

۱۸- جسٹس ملک غلام علی کے مطابق سیّد مودودی نے خود مولانا محمد علی جوہرؔ کی آرزو کو بیان کیا ہے: یہ غوغا آرائی ایک مدّت تک بڑے زور وشور سے جاری رہی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ان بہتان تراشیوں سے تنگ آکر جامع مسجد دہلی میں ایک تقریر کی اور آبدیدہ ہوکر کہا کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان الزامات کے جواب میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرتا۔ تقریر سننے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ میں جب وہاں سے اٹھا تو یہ سوچتا ہوا اٹھا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کروں''۔ (مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۵۱-۲۵۲)

۱۹- ڈاکٹر ایچ بی خان کے مطابق سیّد مودودی نے ۱۶ مئی ۱۹۲۸ء کو الجمیعۃ کی ادارت سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ ایچ بی خان کے نام مکتوب میں مولانا مودودی نے بھی اس تاریخ کی تصدیق کی ہے۔ (تذکرہ سیّد مودودی، اوّل، مرتبہ: جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد، (لاہور، ادارہ معارف اسلامی، اپریل ۱۹۸۶ء)، ص ۱۸۵، ۱۸۶۔ خودنوشت، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، مشمولہ: نقوش آپ بیتی نمبر، [مدیر: محمد طفیل، ۱۹۲۳ء-۴ جولائی ۱۹۸۶ء]، (لاہور: ادارہ فروغِ اردو، جون ۱۹۶۴ء)، ص ۱۲۹۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تذکرہ سیّد مودودی، دوم، ۱۹۹۸ء [مقالہ: صفت برق چمکتا ہے ترا فکر بلند، از پروفیسر سیّد محمد سلیم: ۱۹۲۲ء- ۲۷/اکتوبر ۲۰۰۰ء]، ص ۱۴۳-۱۴۸

۲۰- اخبار الجمیعۃ، ۲ فروری، ۱۹۲۷ء، بہ حوالہ: وثائق مودودی، مرتبہ: سلیم منصور خالد (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۸۴ء)، ص ۸۰

۲۱- ڈاکٹر سفیر اختر، مقالہ: 'مولانا مودودی اور معارف'، در تذکرہ سیّد مودودی، اوّل (اپریل ۱۹۸۶ء، حوالہ مذکور)، ص ۱۶۴

۲۲- عبدالماجد دریابادی (مرتب)، مکتوباتِ سلیمانی، (لکھنؤ: صدق جدید بک ایجنسی ۱۹۹۳ء)، حصّہ اول، ص ۲۴۵۔ ڈاکٹر سفیر اختر، حوالہ بالا۔

۲۳- ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۴۰۳

۲۴- ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۳۰ء، ص ۲-۳

۲۵- بشیر احمد ڈار (مرتب)، انوارِ اقبال (کراچی: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۱۸

۲۶- ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۲۵/اپریل ۱۹۵۴ء بہ حوالہ: ڈاکٹر سفیر اختر: بیاد سیّد مودودی، (دارالمعارف، لوہسر شرقو، ۱۹۹۸ء) ص ۱۶

۲۷- ہفت روزہ ایشیا، لاہور، [مدیر: چودھری غلام جیلانی-۱۹۲۱ء-۱۸ جنوری ۱۹۹۰ء] ۱۷/اپریل ۱۹۶۹ء، نیز رحیم بخش شاہین، [۱۹۴۲ء-۱۸ جولائی ۱۹۹۸ء]، اوراقِ گم گشتہ، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۸۶

۲۸- رئیس احمد جعفری، دیدو شنید، (کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی ۱۹۸۴ء)، ص ۵۶

۲۹- سید ابوالاعلیٰ مودودی، تصریحات، مرتبہ: سلیم منصور خالد (لاہور: البدر پبلی کیشنز، نومبر ۲۰۰۹ء)، ص ۲۵۳

۳۰- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۲۵۲-۲۵۳

۳۱- ایضاً، ص ۳۸۳